ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1, 2024

تبسم کاشمیری کی "تاریخِ ادبِ اردو (ابتدا سے 1857ء تک)": تنقیدی مطالعہ

Tabbassum Kashmiri's "History of Urdu Literature (From the beginning to 1857)": A Critical Study

ڈاکٹر سید شیراز علی زیدی

انچارج، شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

Dr.Syed Shiraz Ali Zaidi

Incharge, Department of Iqbal Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad.Pakistan.
shiraz.ali@aiou.edu.pk

Abstract

Tabbassum Kashmiri's "History of Urdu Literature, till 1857" was published in 2003. A study of this book revealed that it was not written with proper planning. Especially, its structure has so many faults. Kashmiri did not take pain for new research of literary facts and new information of this field also. Although he claims to see Urdu literature with his own vision, he does not give anything new. So, it is right to say that his book is not a fine addition in this field and Kashmiri could not make a reasonable place among the writers of the history of Urdu literature.

Key Words: History, Urdu literature, structure, information, Tabbassum Kashmiri

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ 'ابتدا سے 1857 تک' سنہ 2003 میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی۔ وہ اس سے قبل "آبِ حیات" اور رام بابو سکسینہ کی "تاریخِ ادب اردو" کو حواشی و تعلیقات اور مقدمے کے ساتھ مرتب کر چکے ہیں۔ انھوں نے اصولِ ادبی تحقیق پر "ادبی تحقیق" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ جدید اور کلاسیکی ادب کے حوالے سے ان کی کتابیں، "جدید اردو شاعری میں علامت نگاری"، "نئے شعری تجزیے"، "شعریاتِ اقبال"، "لا = راشد" اور اس کے علاوہ "فسانہ آزاد ایک تجزیہ" شائع ہو چکی ہیں۔ اس سے ان کی تحقیقی کاوشوں، تنقیدی بصیرت اور ادبی وابستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کاشمیری 1981ء میں اوساکا یونیورسٹی کے شعبہ بین الاقوامی تعلیمات (Foreign Studies) میں اردو زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے تعینات ہوئے، وہیں اس تاریخ ادب کی داغ بیل پڑی۔ تبسم کاشمیری نے کلماتِ تشکر کے ذیل میں اس تاریخِ ادب کی تصنیف کا جو محرک بیان کیا ہے۔ وہ اس ادبی تاریخ کی حیثیت متعین کرنے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے بیان کے مطابق گریجوایٹ کلاس کے جاپانی طلبا نے ان سے افسانے اور شاعری کی بجائے اردو ادب کی تاریخ پڑھانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ یقیناً انھی طلبا کو پڑھانے کے لیے تبسم کاشمیری نے نوٹس تیار کرنے کے لیے کچھ مواد جمع کیا ہو گا۔ جیسا کہ انھوں نے خود رقم کیا ہے:

> "ان لیکچرز کی تیاری کے لیے مجھے بے شمار مواد دیکھنا پڑا، ادبی تہذیبی، ثقافتی اور فکری تواریخ کو کھنگالنا پڑا۔ اس دوران میرے پاس کثیر تعداد میں یہ مسالا جمع ہو گیا۔ چناں چہ 1996 کے لگ بھگ میں نے اردو ادب کی موجودہ تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کا خاکہ تیار کیا اور کام شروع کر دیا۔"(1)

پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک لکھی گئی اہم ادبی تواریخ پر ان کی نظر رہی۔ رام بابو سکسینہ، عبدالقادر سروری، احتشام حسین، محمد حسن، محمد صادق، جمیل جالبی، گیان چند اور سیدہ جعفری کی تاریخ نگاری کا حوالہ دیتے ہوئے ان کا فرمانا ہے کہ ان تواریخ میں تاریخ نگاروں کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے، یعنی ادبی تاریخ کا خام مواد موجود رہتا ہے مگر اس مواد سے جو تاریخ سامنے آتی ہے، وہ مورخ کی تاریخی بصیرت سے بر آمد ہوتی ہے۔ جیسے کہ عبدالقادر سروری نے اپنی تاریخ میں ادب کو سیاسی، تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی حوالوں میں دیکھا ہے، سیدہ جعفر اور گیان چند نے تمام زور ادبی حقائق پر صرف کیا ہے، احتشام حسین نے مارکسی نقطہ نظر کو ملحوظ رکھا ہے۔ تبسم کاشمیری کا موقف ہے کہ ادبی مورخ کے پاس تاریخی واقعات و حقائق ایسے موجود ہوتے ہیں جیسے مچھلی فروش کے تختے پر مچھلی، ادبی مورخ تاریخ کے تختے سے ان حقائق کی طباخی کر کے اپنی مرضی سے پیش کرتا ہے۔(2) وہ اپنے نکتہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1, 2024

"ادبی مورخ کا کام صرف واقعات و حقائق تک محدود نہیں ہے۔ وہ واقعات اور حقائق سے آگے بڑھ کر ایک اور اہم فریضہ انجام دیتا ہے۔ واقعات و حقائق اور تاریخ کے مطالعے سے وہ ادبی تاریخ کے کسی دور، رجحان، نظریے یا کسی شخصیت کے بارے میں ایک وژن (Vision) مہیا کرتا ہے۔ ادب کی تاریخ کو جو قوت ادبی تاریخ بناتی ہے، وہ ادبی مورخ کا وژن ہے۔"(3)

اب جہاں تک وژن اور تاریخی بصیرت کا تعلق ہے تو کاشمیری نے اپنی اس تاریخ کے بارے میں یہ دعوا کیا ہے کہ:

"جب ہم کسی خاص ادبی دور کا تجزیہ کریں گے تو اپنا تجزیہ محض ادب کے شعبہ تک محدود نہیں رکھیں گے بل کہ ہم اس دور کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیومالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی و ثقافتی عوامل فلسفہ اور نفسیات کی روشنی میں اس دور کا تجزیہ مکمل کریں گے۔ اس مطالعے میں بنیادی اہمیت تو ادب ہی کو حاصل رہے گی مگر ادب پر اثر انداز ہونے والے دیگر عوامل اور محرکات کا مطالعہ بھی ساتھ ساتھ کریں گے۔"(4)

اس پیش لفظ اور کلماتِ تشکر کے مطالعے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

I۔ اس تاریخ کے مرتب کرنے کا محرک جاپانی طلبا کے لیے تیار کیے جانے والے لیکچر یا نوٹس وغیرہ بنے۔

II۔ دبے لفظوں میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ادبی حقائق کی جانچ پڑتال کے چکر میں پڑنے کی بجائے مواد کا تجزیہ کر کے اپنے وژن سے تاریخ کو دیکھا جائے گا۔

III۔ تجزیوں میں ادوار کے سماجی و اقتصادی علوم، دیومالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی و ثقافتی عوامل، فلسفہ اور نفسیات سے مدد لی جائے گی۔

اس ادبی تاریخ کے جائزے سے پہلے مصنف کا نکتہ نظر واضح ہونا ضروری تھا بالخصوص اس وقت جب کہ زیرِ مطالعہ کتاب سے پہلے اور بعد میں ادب کی کئی تواریخ سامنے آچکی ہیں جن میں سے بعض کو درجہ استناد بھی حاصل ہوا۔ لہٰذا یہ جاننا ضروری تھا کہ آخر وہ کون سی وجوہات تھیں جن کی بنا پر مصنف نے ایک نئی ادبی تاریخ لکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ کاشمیری کا نکتہ نظر واضح ہونے کے بعد یہ آسان ہو گیا ہے کہ دیگر تواریخ کی موجودگی میں اس ادبی تاریخ کی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکے اور اس کے ساتھ یہ جانچ بھی کی جا سکے کہ مصنف نے اپنے نکتہ نظر کے مطابق اس کتاب کی اشاعت سے کس قدر کامیابی حاصل کی ہے۔ جب مصنف کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اپنے ذہن میں اس کا خاکہ ترتیب دیتا ہے۔ وہ اس خاکے کے مطابق مواد کو کتاب کی صورت میں ڈھالتا ہے۔ خاکے کی یہی منصوبہ بندی کتاب کی ساخت اور ہئیت کا تعین کرتی ہے۔

تبسم کاشمیری نے "کلماتِ تشکر" کے ذیل میں کہا ہے کہ 1996ء میں جب انھوں نے تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تو اس سے پہلے ان کے پاس کافی مواد جمع ہو چکا تھا اور وہ طلبا کے لیے لیکچر بھی تیار کر چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے خاکہ تیار کر کے کام شروع کیا اور پانچ سال اس میں صرف کیے۔(5) اب دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے تاریخِ ادب کا کیا خاکہ تیار کیا اور اس کی ترتیب و تشکیل میں کس بصیرت کا ثبوت دیا۔ اس کے لیے ہم کتاب کے ابواب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کتاب کو جس کی ضخامت 872 صفحات ہے، فہرستِ ابواب کے مطابق 19 ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ متنِ کتاب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فہرست میں دیے گئے کئی ابواب کے عنوانات اور متن میں دیے گئے عنوانوں میں لفظی اختلاف پایا جاتا ہے۔ جن ابواب کے عناوین متن میں فہرست سے مختلف ہیں وہ یہ ہیں:

باب	فہرست میں باب کا عنوان	متنِ کتاب میں باب کا عنوان
باب نمبر 1	کوئی عنوان نہیں دیا گیا	زبان کا ابتدائیہ۔ پنجاب اور زبان کے ابتدائی نقش کا تصور۔ نقلِ لسان کے دو مراحل
باب نمبر 3	گجری ادب: گجرات	گجری ادب
باب نمبر 4	بہمنی دور	بہمنی دور کا ادب
باب نمبر 5	بیجاپور: عادل شاہی دور کا ادب	بیجاپور کا ادب، عادل شاہی دور
باب نمبر 6	گول کنڈہ: قطب شاہی دور کا ادب	گول کنڈہ کا ادب، قطب شاہی دور
باب نمبر 7	ولی، مکر جو روایت کا ثمر۔ دکنی غزل کا نکتہ عروج	ولی: مرکز جو روایت کا ثمر

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1, 2024

باب نمبر9	شمالی ہند میں نئی لسانی روایت کا آغاز ولی کی کرامتِ سخن۔ ریختہ گو شعرا کا عہد	شمالی ہند میں نئی لسانی روایت کا آغاز اور محرکات
باب نمبر10	ادبی روایت کا استحکام۔ عہد ساز شعرا کا دور	میرؔ و سوداؔ کا دور
باب نمبر13	انیسویں صدی میں اردو زبان کے دو ادارے	فورٹ ولیم کالج، سیاست، تاریخ اور اسلوب کی تشکیل
باب نمبر15	مقامی رنگ اور عوامی روایت کا شاعر: نظیر اکبر آبادی	عوامی روایت کا شاعر، نظیر اکبر آبادی
باب نمبر17	دلی میں کمپنی کی عمل داری، کمپنی کی سیاسی حکمتِ عملی اور مغلوں کے علامتی اقتدار کا خاتمہ	کمپنی کی عمل داری، کمپنی کی سیاسی حکمتِ عملی اور مغلوں کے علامتی اقتدار کا خاتمہ
باب نمبر19	اردو مرثیہ: لکھنؤ کی مذہبی ثقافت کا ایک مظہر	مرثیہ: لکھنؤ کی مذہبی ثقافت کا ایک مظہر

یہ تو تھا فہرست اور متن میں دیے گئے عنوانات کا فرق، اب ایک نظر ذیلی عنوانوں کو بھی دیکھتے چلیے۔ فہرست میں ابواب کے ذیل میں جو تفصیلات فراہم کی گئی ہیں ان سے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ابواب کی تفصیلات ہیں یا ذیلی عنوانات ہیں۔ مثلاً پہلے باب ہی کو لیجیے۔ اس میں باب کا کوئی عنوان نہیں مگر باب نمبر کے نیچے نفسِ مضمون کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ متن میں بھی پہلے باب میں کوئی ذیلی عنوان نہیں ہے۔ فہرست میں دوسرے اور تیسرے باب کے ذیل میں شعرا کے جو نام دیے گئے ہیں، وہ متن میں باب کے ذیلی عنوانات ہیں۔ جب کہ فہرست میں چوتھے باب کے ذیل میں جو تفصیلات دی گئی ہیں ان میں سے کچھ نفسِ مضمون کے متعلق معلومات ہیں اور کچھ کو متن میں ذیلی عنوانات دیے ہیں۔ ساری کتاب میں تقریباً یہی صورتِ حال ہے۔ اس کے علاوہ فہرست میں دیے گئے ابواب کے ذیلی عنوانوں اور متن میں دیے گئے ذیلی عنوانات میں بھی لفظوں اور ترتیب کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ جیسے کہ فہرست میں باب نمبر2 کا ایک ذیلی عنوان "نوشہ گنج بخش" اور دوسرا "افضل" ہے۔ متن میں یہ "حضرت نوشہ گنج بخش" اور "گنج الاسرار" اور "افضل کی بکٹ" دیے گئے ہیں۔

باب نمبر 5 میں عادل شاہی دور کے شعرا کو فہرستِ ابواب میں اس ترتیب سے ذیلی عنوانات دیے گئے ہیں: برہان الدین جانمؔ، امین الدین اعلیٰؔ، عبدلؔ، شوقیؔ، نصرتیؔ، صنعتیؔ، مقیمیؔ، متن میں یہ ترتیب یوں ہے: برہان الدین جانمؔ، عبدلؔ، مقیمیؔ، صنعتیؔ، امین الدین اعلیٰؔ، حسن شوقیؔ، نصرتیؔ۔ اسی طرح آٹھویں باب کو "الف" اور "ب" دو حصوں میں تقسیم کیا۔ حصہ "ب" فہرست میں جعفر زٹلیؔ کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے۔ متن میں صفحہ 243 پر اس باب میں حصہ "ب" بھی بھی تاریخ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ جعفر زٹلیؔ کو صفحہ 252 پر نئے صفحے اور نئے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

اب کے حواشی دینے کے لیے بھی یکساں طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ حواشی و حوالے عام طور پر پاورقی یا باب کے آخر میں یا کتاب کے خاتمے پر درج کیے جاتے ہیں۔ تبسم کاشمیری نے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے کہ پہلے چھ ابواب کے حوالے تو ابواب کے آخر میں دیے ہیں لیکن اس کے بعد ساتویں باب میں جو ولیؔ دکنی اور سراجؔ اورنگ آبادی کے بیان میں ہے۔ ولی دکنی کے عنوان کے بعد حوالے دے کر بظاہر تو باب کا خاتمہ کر دیا ہے مگر حوالے دینے کے بعد نئے صفحے سے سراجؔ کو جلی عنوان دے کر صفحہ 229 تا صفحہ 233 بیان کیا ہے۔ سراجؔ کا تمام ذکر کسی حوالے کے بغیر ہے۔ اس کے بعد صفحہ 234 سے آٹھواں باب شروع ہو جاتا ہے۔ اس باب میں بھی جو سیاسی تاریخ اور جعفر زٹلیؔ کے متعلق ہے، سیاسی تاریخ کے بیان کے بعد صفحہ 250-251 پر حوالے دے کر جعفر زٹلیؔ کو نئے صفحے اور جلی عنوان دے کر بیان کیا ہے اور اس کے حوالے الگ سے بیان کے آخر میں صفحہ 258 پر دیے ہیں۔

نویں باب میں ایک اور منفرد طریقہ استعمال کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ باب کے عنوان اور ذیلی عنوانوں کے مطابق باب کے آخر میں تین عنوانات قائم کر کے حوالے دیے ہیں۔ یعنی نویں باب کا خاتمہ صفحہ 285 پر ہوتا ہے۔ اب اسی صفحے ایک عنوان "شمالی ہند میں نئی لسانی روایت کا آغاز اور محرکات" کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد صفحہ 286 پر ایک عنوان "ایہام گو شعرا" کے تحت حوالے دیے گئے ہیں۔ پھر اسی صفحے پر تیسرا عنوان "نئی شعریات کا ظہور" بنا کے حوالے دیے ہیں۔ واضح رہے کہ ان تینوں عنوانوں کے تحت ایک ہی باب کے حوالے دیے گئے ہیں اور ہر عنوان میں حوالے کا نمبر نئے سرے سے شروع ہوتا ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1, 2024

ذیلی عنوانات کے سلسلے میں عدم احتیاط کی وجہ سے فہرست کے مقابلے میں کچھ عنوانات ابواب کے متن سے غائب ہیں۔ مثلاً چوتھے باب میں فہرست میں نظامیؔ، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، مشتاقؔ، لطفیؔ، میر اںؔ جیؔ، شمس العشاق، فیروزؔ، اشرف بیابانیؔ، وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان میں نظامیؔ، بندہ نوازؔ، شمس العشاقؔ، فیروزؔ، اشرف بیابانی کو تو ذیلی عنوانات کے تحت بیان کیا ہے مگر مشتاقؔ اور لطفیؔ کے لیے کوئی عنوان نہیں ہے جب کہ قاعدے کے مطابق ان کا ذکر بھی ذیلی عنوانات دے کر کرنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس فہرست میں گیارہویں باب میں کوئی ذیلی عنوان نہیں دیا گیا جب کہ متن میں تین ذیلی عنوانات: "سیاست، اور تاریخ"، "تہذیب" اور "ادب" موجود ہیں۔

بعض ذیلی عنوانات کو نئے صفحے اور بڑی تقطیع کے جلی عنوان سے نئے باب کی طرح شروع کیا ہے۔ مثلاً سراجؔ کا ذکر ساتویں باب میں نئے صفحے اور بڑی تقطیع کے جلی حروف میں کیا ہے حال آں کہ یہ ذیلی عنوان ہے۔ یہی حال آٹھویں باب میں جعفر زٹلیؔ کا اور تیرھویں باب میں دلی کالجؔ کا ہے جنھیں فہرست میں ابواب کی تقسیم کے مطابق ذیلی عنوان ہونا چاہیے۔

اس کے علاوہ کتاب کے موضوعات میں بھی اعتدال کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ موضوعات افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ادبی تاریخ کی یہ کتاب سنہ 1000 صدی عیسویں سے اپنا سفر شروع کرتی ہے۔ اس میں 857 سالہ ادبی تاریخ کو پیش لفظ وغیرہ اور کتابیات واشاریے کے علاوہ حوالوں سمیت قریب 800 صفحات میں سمیٹا گیا ہے۔ ان 800 صفحات میں مشاہیر میں سے ولی کو 18 صفحات، میرؔ کو 28، میر حسنؔ کو 20، مصحفیؔ کو 19، انشاؔ، جرأتؔ اور مضمونؔ کو 33، آتشؔ و ناسخؔ کو 30، دیا شنکر نسیمؔ کو 19، نظیرؔ کو 27، غالبؔ کو 59، مومنؔ کو 19، ظفرؔ کو 18، شیفتہؔ کو 13، سوداؔ کو 19، دردؔ کو 13، ذوقؔ کو 11، جب کہ "باغ و بہار" اور "فسانہء عجائب" کے تجزیوں کو 44 صفحات دیے گئے ہیں۔ یہ کل 480 صفحات بن جاتے ہیں۔

بدستور سیاسی تاریخ کے آٹھویں باب کے 17، گیارھویں کے 39 اور سترھویں کے 18 ملا کر 64 صفحات بنتے ہیں۔ واضح رہے کہ سیاسی ماحول سے متعلق یہ ابواب الگ ہیں ورنہ جزیات تقریباً ہر باب میں بکثرت موجود ہیں۔ سیاسی تاریخ کے 64 صفحات کو 480 صفحات میں شامل کیا جائے تو 800 میں سے 544 صفحات صرف چند مشاہیر اور سیاسی تاریخ پر صرف کیے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی 857 سالہ لسانی و ادبی تاریخ کو فورٹ ولیم کالج اور مرثیے سمیت صرف 336 صفحات میں سمیٹا گیا ہے۔ اس ادبی تاریخ میں وہ تمام عیوب بدرجہ اتم موجود ہیں جو کسی ناقص خاکے میں ہو سکتے ہیں۔ خاکے پر نظر ڈالنے کے بعد اب ایک نظر اس کتاب کی تحقیقی نوعیت پر بھی ڈال لیتے ہیں۔

بعض مقامات پر حوالے مفقود ہیں۔ مثلاً دوسرے باب میں بابا فرید رح کے ذکر میں کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ درمیان میں یہ لکھا ہے کہ ان مباحث کے لیے گیان چند کی تاریخِ ادبِ اردو کی جلد اول سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ بابا فرید رح کی تاریخِ ولادت و وفات ذیلی عنوان کے تحت صفحہ 29 پر 1266-1173 بتائی ہے۔ اس کے بعد متن میں بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے کہ آپ کی تاریخ پیدائش 1188ء-854ھ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ ادب میں سالِ ولادت 1173ء تسلیم کیا ہے جس کے مطابق ہجری سنہ 569 ہے نہ 584ھ۔ جالبی نے بابا فرید رح کا سالِ وفات 1265ء مطابق 664ح بتایا ہے۔(6)

چوتھے باب میں صفحہ 99 پر اشرف بیابانی کا ذکر بغیر کسی حوالے کے موجود ہے۔ پانچویں باب میں صنعتیؔ کا ذکر صفحہ 116 تا 118 بغیر کسی حوالے کے ہے۔ چھٹے باب میں محمود کے ذکر صفحہ 151 تا 153 میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اسی باب میں ابنِ نشاطی کا بیان صفحہ 198 تا 201 بغیر کسی حوالے کے ہے۔ ساتویں باب میں سراجؔ اورنگ آبادی کے ذکر صفحہ 229 تا 233 میں کہیں کوئی حوالہ نہیں آیا۔ کئی مقامات پر بعض ادبی حقائق اور بحثوں کے پیراگراف کے پیراگراف بغیر کسی حوالے کے لکھے گئے ہیں۔ ایک مثال دیکھیے۔ دسویں باب میں سوداؔ کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

> "دلی کے اسی سیاسی و ادبی ماحول میں مرزا رفیع سوداؔ 1706ء/1154ھ کے لگ بھگ ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوتے ہیں جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب اپنے نصف النہار پر پہنچ کر احمد آباد میں شاہ برہان الدین غریبؔ کے احاطہ میں غروب ہو چکا تھا۔۔۔ الخ"(7)

یہ پیراگراف ساڑھے تیرہ سطور پر مشتمل ہے مگر اس کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسرا پیراگراف جو کہ ساڑھے آٹھ سطور کا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ:

> "سوداؔ نے 38-1728ء/50-1140ھ کے لگ بھگ مشق سخن کا آغاز کیا اور شاہ حاتمؔ کی شاگردی اختیار کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں مراختوں کا دور چل رہا تھا۔ سوداؔ فارسی کی جانب مائل تھے۔۔۔ الخ"(8)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1, 2024

لیکن کوئی حوالہ نہیں ہے۔ یہ صورتِ حال اکثر مقامات پر ہے۔ شعرا کے سنینِ ولادت وفیات کے سلسلے میں بھی عدم احتیاطی نظر آتی ہے۔ کہیں تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مذکور سنہ شاعر کا سن ولادت ہے یا وفات۔ مثلاً صفحہ 60 پر قاضی محمود دریائی کی ذیلی سرخی کے نیچے جو سنہ 1534ء/941ھ دیا گیا ہے اس پر وفات یا پیدائش کی نشان دہی نہیں ہے۔ چوں کہ متن میں بھی اس پر کوئی بحث نہیں ہے اس لیے یہ قاری کی اپنی صوابدید پر ہے کہ وہ اسے تاریخ پیدائش سمجھے یا وفات۔ شعرا کی ولادت اور وفات کے سال کے متعلق اکثر حوالے نہیں ملتے کہ کہاں سے لیے گئے ہیں۔ حال آں کہ بعض شعرا کی پیدائش اور وفات کی تاریخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لیے جب کوئی تاریخ درج کی جائے تو حوالہ لازمی دینا چاہیے۔ سودآ ہی کی مثال لے لیجیے۔ سودآ کی تاریخِ ولادت کے سلسلے میں کافی اختلاف موجود ہے۔ جالبی نے تحقیق کر کے 1188ھ کو درست سالِ ولادت قرار دیا ہے۔(9) تبسم کاشمیری نے بھی صفحہ 291 پر 1188ھ کے لگ بھگ لکھا ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اسی طرح صفحہ 35 پر کبیر کی سرخی کے ذیل میں سالِ پیدائش 1440ء سے 1470ء کے درمیان جانے کہاں سے لیا ہے۔ جب کہ متن میں لکھتے ہیں کہ:

> "کبیر کے دو بڑے محققوں، پنڈت چتر ویدی اور ڈاکٹر واڈی وائل (Dr. Vaudivile) کے بقول کبیر کا یقینی سالِ پیدائش بتانا ممکن نہیں مگر زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ 1398ء میں پیدا ہوا اور 1448ء میں وفات پا گیا۔"(10)

جب کبیر کے دو بڑے محققوں نے پیدائش اور وفات کے سال اپنی تحقیق کے مطابق مقرر کر دیے ہیں اور انھیں بڑے محقق بھی قرار دیا جا رہا ہے تو ابتدا میں جلی حروف میں (پیدائش 1470ء۔1440) کس محقق کی تحقیق کے مطابق لکھی گئی ہے اور چتر ویدی اور واڈی وائل کی مقررہ تاریخوں رد کرنے کی کیا وجہ ہے؟ یہ بتانا چاہیے تھا۔ بعض شعرا کا سالِ ولادت معلوم نہ ہو سکنے کے باوجود صرف سالِ وفات دیا ہے اور وہ بھی بغیر حوالے کے۔ مثلاً صفحہ 41 پر حضرت نوشہ گنج بخش رح کی وفات کا سال 1465ء بغیر حوالے کے درج کیا ہے جب کہ ولادت کے سال سے صرفِ نظر کیا ہے۔ نوشہ گنج رح کے سلسلے میں جالبی کی تاریخ ان کے سامنے تھی اور انھوں نے صفحہ 42 پر "گنج الاسرار" کے متعلق جالبی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جالبی نے گنج بخش کی تاریخِ ولادت وفات 959ھ۔1064ھ بہ مطابق 1551ء۔1653ء تحریر کی ہیں۔(11) کاشمیری نے سنین بھی اکثر عیسوی دیے ہیں اور جہاں کہیں ھجری سال دیے ہیں وہاں بھی ان کے بالمقابل ایک عیسوی سال دیا ہے۔ جب کہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اگر ہجری سال کا مہینا اور تاریخ معلوم نہ ہوں تو اس کے ساتھ دو عیسوی سال دیے جائیں۔

تبسم کاشمیری کلاسیکی ادب کی کتابوں کے نام بھی اپنی مرضی سے درج کر دیتے ہیں۔ صفحہ 93 پر میراں جی شمس العشاق کی ایک مثنوی کا نام "شہادت الحقیقت" لکھا ہے۔ شمس العشاق رح نے اس نام کی کوئی مثنوی نہیں لکھی۔ جمیل جالبی نے اس کا نام "شہادت التحقیق" درج کیا ہے۔(12) مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کا نام "شہادت الحقیق" ہے اور اس مثنوی کے درج ذیل شعر سے یہ نام ثابت ہے: "اس نام ہے تحقیق سن شہادت الحقیق" اگرچہ حقیق کوئی مسلمہ لفظ نہیں ہے مگر جب شاعر نے خود اسے یہ نام دیا ہے تو تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔(13)

اشعار میں باندھے گئے ناموں کی بنا پر بغیر کسی تاریخی دستاویز کے نتائج قیاس کر لیے گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ 81 پر "قدم راؤ پدم راؤ" کے مصنف نظامی کے نام فخر دین سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ چوں کہ اس قسم کے نام پنجاب میں رکھے جاتے ہیں اس لیے ان کے خاندان کا تعلق کسی نہ کسی صورت پنجاب سے تھا۔ حال آں کہ یہ ممکن ہے کہ نام "فخر الدین" ہو جسے ضرورتِ شعری کے تحت "فخر دین" باندھ لیا گیا ہو۔(14) ابو اللیث صدیقی نے اپنی "تاریخ زبان و ادبِ اردو" میں نظامی کا نام "فخر الدین" لکھا ہے۔(15) کاشمیری ادبی تجزیوں میں بھی مصنفین اور شعرا کی کتب سے براہ راست استفادے کی بجائے ثانوی ماخذ پر انحصار کرتے ہیں۔ مثلاً قلی قطب شاہ کے ذکر میں ڈاکٹر زور کی مرتب کردہ "کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" کا حوالہ دے کر قلی قطب شاہ کی پیاریوں کا سراپا دکھانے کے لیے اشعار کے نثری ترجمے دیے ہیں۔ اسی طرح بعض ضروری مقامات پر تصانیف سے نمونے دینے میں بھی بخل سے کام لیا گیا ہے۔ جیسے کہ صفحہ 99 پر اشرف بیاباںی کی تصنیف "نوسرہار" کا تذکرہ ہے اور کاشمیری اسے بہمنی دور کے آخری سالوں کا لسانی اور شعری تجربہ قرار دیتے ہیں مگر اس کی کوئی مثال نہیں دیتے۔ سودا کے بیان میں ان کی ہجویات کا ذکر ہے مگر کوئی مثال موجود نہیں۔

کمال یہ ہے کہ مرثیے کے باب میں انیس و دبیر کے مرثیوں کا ایک بند بھی نہیں دیا گیا۔ حیرت اس وقت اور بڑھی جب کتابیات کو دیکھا گیا تو کسی مرثیہ گو کی کلیات یا مجموعے کا نام نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کاشمیری نے مرثیوں کی صرف تنقید ہی پڑھی ہے، کوئی مرثیہ ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے برعکس تصانیف کے خلاصے دینے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ مثلاً پانچویں باب "بیجاپور کا دب" میں صفحہ 105 پر عادل شاہ ثانی کی کتاب "نورس" سے نمونہ کلام پیش کرنے کی بجائے۔ کتاب کے متعلق

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1, 2024

ڈاکٹر نظیر احمد کے عالمانہ تعارف کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ صفحہ 116 پر "قصہ بے نظیر" کے خالق صنعتیؔ کا ذکر کیا ہے اور اس کی مثنوی کا خلاصہ اڑھائی صفحات میں پیش کیا ہے۔ کاش اس کی بجائے دو چار اشعار ہی بطور نمونہ درج کر دیے ہوتے۔

وہ بعض ادبی حقائق سے بھی لاعلم معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے صنعتی کی صرف ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے مگر نصیر الدین ہاشمی نے صنعتیؔ کی ایک اور مثنوی "گل دستہ" کا ذکر بھی کیا ہے۔(16) صفحہ 107 پر رقم طراز ہیں کہ اگرچہ "تاج الحقائق" کو وجہی سے منسوب کیا گیا ہے مگر جالبی اسے وجیہ الدین محمد کی تصنیف بتاتے ہیں۔ کاشمیری کو معلوم نہیں کہ ڈاکٹر انور سعید نے اپنی مرتبہ "تاج الحقائق" میں جو کہ بمبئی سے 1970ء میں شائع ہوئی دلائل سے اسے وجہی کی تصنیف ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شو پرشاد جاوید شسٹ بھی اسے وجہی کی تصنیف مانتے ہیں۔(17) کشمیری کو بتانا چاہیے تھا کہ جالبی کن دلائل کی بنا پر اسے وجیہ الدین محمد کی تصنیف قرار دیتے ہیں اور کاشمیری کا اپنا کیا تجزیہ ہے۔

بنیادی ماخذ سے براہ راست استفادہ نہ کرنے کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی کو دوسروں کے تجزیوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ کاشمیری نے صفحہ 122 پر لکھا ہے کہ "خود بادشاہ کی کتاب 'نورس' سے اردو کی روایت شروع ہوتی ہے۔" انھوں نے شاید "نورس" نہیں دیکھی، اس لیے کلام کا نمونہ بھی نہیں دیا۔ گیان چند نے "نورس" سے بھیروں راگ کے کچھ اشعار دیے ہیں نمونہ یہ ہے:

بھیرو کر پور گورا بھال تلک چندرا تری نیتر اجٹا مکٹ گنگا دھرا (18)

کیا اس زبان کو اردو کہا جا سکتا ہے۔؟ کاشمیری یقیناً لسانیات کے آدمی بھی نہیں ہیں اس وجہ سے انھوں نے تاریخ زبان سے متعلق باب پر بھی خاص توجہ نہیں دی۔ لسانیات کے متعلق ان کی معلومات سنیتی کمار چٹرجی، محمود شیرانی، عبدالقادر سروری اور زور تک محدود ہیں۔ انھی کی کتب کے حوالے کاشمیری نے اس باب میں دیے ہیں۔ اردو کے ماخذ کے بارے میں ان کے بیانات خاصے الجھے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> "غزنوی عہد کے پنجاب کی زبان لاہوری (پنجابی) تھی جو پورے علاقے کا ذریعہء اظہار تھی۔ اس زبان پر ایرانی فتوحات اور حملوں کے بعد لسانی اثرات مزید بڑھنے لگے تھے اور جب 1021ء میں غزنوی دور میں لاہور مرکز قرار پایا تو یہ اثرات مزید گہرے ہوتے ہوئے ایک نیا لسانی عمل ظاہر کرنے لگے۔ ترکی، عربی، فارسی، پنجابی اور مقامی اپ بھرنش کے باہمی ملاپ سے زبان کا ایک ایسا اسلوب تیار ہونے لگا جو مقامی آبادی اور نئے آبادکاروں کے لیے نیا ذریعہء اظہار بنتا گیا۔"(19)

لسانیات کا ایک معمولی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ ایک نئی زبان کسی ایک ہی قدیم زبان سے ارتقا پاتی ہے۔ کئی زبانیں مل کر ایک زبان پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ اردو نے کسی ایک ہی زبان سے ارتقاء پایا ہے جو کہ قرائن کی رو سے پنجابی نہیں ہو سکتی۔ کاشمیری بھی دراصل بہت سے لوگوں کی طرح اس غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں کہ شیرانی نے اردو کے پنجابی سے ماخوذ ہونے کا دعوا کیا ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اپنی تاریخ زبان وادب میں اردو کے پنجابی سے ماخوذ ہونے کے نظریے سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جارج گریرسن نے اپنی کتاب "جائزہ لسانیہ ہند" میں پنجابی کو اردو سے قریب ترین قرار دیا ہے جس کا ایک اقتباس حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں تحریر کر دیا جس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اردو پنجابی سے نکلی یا اس کی ترقی یافتہ شکل ہے جب کہ یہ دعوا نہ تو گریرسن نے کیا ہے اور نہ ہی شیرانی نے۔(20)

مقامی اُپ بھرنش سے کاشمیری کی مراد جانے کون سی اپ بھرنش ہے۔ 1000ء کے لگ بھگ جس اپ بھرنش کا حلقہ اثر سب سے زیادہ وسیع تھا وہ شورسینی اپ بھرنش تھی۔ اس کا حلقہ اثر پنجاب، راجپوتانہ و گجرات کے ذریعے سندھ اور ملتان میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ برج بھاشا، اودھی، پنجابی اور ہندی وغیرہ اسی اپ بھرنش کی شاخیں ہیں۔(21) اردو کا ماخذ بھی پنجابی کی طرح یہی شورسینی اپ بھرنش سمجھی جاتی ہے جو پہلے کھڑی بولی کی صورت میں ارتقا کی منازل تک پہنچی اور پھر یہ کھڑی بولی نکھر کر اردو کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ تبسم کاشمیری نے صفحہ 21 پر زور کی "ہندوستانی لسانیات" سے ایک اقتباس دیا ہے۔ اس کی چند سطور یہ ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1, 2024

"اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دو آبہ گنگ و جمن میں بولی جاتی تھی۔ کیوں کہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔"(22)

اس بیان سے کاشمیری یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ زورؔ کے خیال میں اردو کی بنیاد پنجابی اور مغربی اپ بھرنش دونوں پر ہے اور اس کے فوراً بعد صفحہ 22 پر لکھتے ہیں کہ:

"سنیتی کمار چٹرجی کے نظریے میں ڈاکٹر زورؔ کی مطابقت ملتی ہے۔ وہ اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ 1193ء میں فتح دلی کے بعد جس نئی بولی کا سلسلہ شروع ہوا اس کی بنیاد پنجابی اور مغربی اتر پردیش کی مغربی اپ بھرنش پر تھی۔"(23)

تاہم زورؔ کے درج ذیل بیان پر کاشمیری کی شاید نظر نہیں پڑی یا انھوں نے جانتے بوجھتے صرفِ نظر کیا ہے:

"اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بل کہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی بولی سے، لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں۔ اس لیے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔"(24)

اگرچہ اب زورؔ کے اس بیان کی بھی کوئی اہمیت نہیں کیوں کہ محققینِ لسانیات اس بات کو عام طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کھڑی بولی ہی کا جدید روپ ہے۔(25)

کوئی محقق جب ادبی تاریخ لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ دستیاب ادبی حقائق کی جانچ پڑتال کر کے ان کے درست یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتا ہے، یا نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس ادبی تاریخ کا یہ پہلو بھی خاصا کمزور ہے۔ اگرچہ ان کے زیر نظر گیان چند، سیدہ جعفر اور جمیل جالبی کی ادبی تاریخیں رہی ہیں لیکن تبسم کاشمیری نے صرف انھی کے مہیا کردہ حقائق کو جوں کا توں بیان کر دیا ہے اپنے تجزیے اور تحلیل کے ذریعے کوئی ایسی معلومات فراہم نہیں کیں جنھیں نئی تحقیق کا جا سکے۔ اس کے برعکس انھوں نے بعض ادبی حقائق کے سلسلے میں شکوک و شبہات کو بڑھایا ہے۔ مثلاً صفحہ 42، 43 پر نوشہ گنجؒ سے منسوب "گنج الاسرار" کے اشعار کے متعلق خورشید احمد خان کی تحقیق کا ذکر کر کے اور ان سے غلط طور پر منسوب کلام کا نمونہ دے کر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اس کلام کی زبان اٹھارویں یا انیسویں صدی کی ہو سکتی ہے، عہدِ جہاں گیری کی نہیں، تاہم اس کے بعد یہ لکھتے ہیں کہ حضرت نوشہ گنجؒ سے منسوب اردو کلام کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے انھوں نے اس وقت اوساکا میں موجود ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو خط لکھا جس کے نوشاہی نے مفصل جواب میں بتایا کہ خورشید احمد کو وہ کم استعداد، ناقص معلومات رکھنے والا اور تحقیقی بصیرت سے عاری سمجھتے ہیں اور خورشید احمد خان کی تحقیق کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ جب کہ گیان چند نے ان کی تحقیق کو اردو تحقیق کا ایک زریں باب قرار دیا ہے۔ کاشمیری اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر گوہر نوشاہی اس بات کو لاشعوری طور پر البتہ قبول کرتے ہیں کہ 'گنج الاسرار' کے دس اشعار ایسے ہیں جن کا انتساب حضرت نوشہ گنجؒ کے علاوہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نوشہ صاحب نے دس شعر بھی کہے ہوں تو 'گنج الاسرار' کو جعلی نہیں کہا جا سکتا۔"(26)

تبسم کاشمیری نے جو اشعار نوشہ گنجؒ سے منسوب کلام کے پیش کیے ہیں۔ ان کا نمونہ یہ ہے:

جو آویں بندیوں کے کام دیں دنیا میں ہوویں تمام
سب قرآن مجید میں آئے حق تعالیٰ نے آپ فرمائے

ان اشعار کو لسانی اعتبار سے نوشہ گنجؒ کی تخلیق قرار دیا جانا اندھیر ہو گا۔ اس لحاظ سے خورشید احمد خان کی تحقیق سو فیصد درست ہے۔ کاشمیری کو چاہیے تھا کہ اگر انھوں نے گوہر نوشاہی صاحب سے اپنی خط و کتابت کو اس تاریخ کا موضوع بنایا ہے تو ان اشعار کی جگہ وہ دس اشعار دیتے جو گوہر نوشاہی کے نزدیک نوشہ گنجؒ کے علاوہ کسی دوسرے سے منسوب نہیں کیے جا سکتے تاکہ قاری کوئی رائے قائم کر سکے، خالی خولی باتیں بغیر ثبوت کے درج کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ غرض کہ ادبی تحقیق کے سلسلے میں اس کتاب میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے نیا اور قابلِ اعتبار قرار دیا جا سکے۔ تحقیق کے بعد آیئے تجزیاتی اور تنقیدی وژن کی طرف۔ کئی جگہ اصل تخلیقات سے براہ راست استفادے کی بجائے ثانوی ماخذ سے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ تنقید کا انداز بھی کچھ ایسا ہے کہ انشاؔ کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "کیا انشا کو معلوم نہ تھا کہ تغزل کیا چیز ہے؟ اور 'جوڑے' یا 'پتھر' کا تغزل سے کوئی ادنیٰ سا تعلق بھی ہے یا نہیں"(27) میں یہ تو نہیں کہتا کہ کاشمیری تغزل کی تعریف سے ایم فل پی ایچ ڈی اردو کے اکثر محققین کی طرح

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1, 2024

ناواقف ہیں۔ تاہم ان کے اس بیان سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ تغزل کا تعلق لفظوں سے نہیں لفظوں کے برتنے سے ہے۔ کوئی بھی لفظ تشبیہ و استعارے میں ڈھل کر تغزل پیدا کر سکتا ہے چاہے وہ 'جُوڑا" ہو یا "پتھر"۔ راقم الحروف نے خود بھی پتھر کے ردیف میں ایک غزل کہی ہے۔ ایک شعر درج ذیل ہے:

اس نے باتوں میں بھی کچھ زخم لگائے گہرے گفتگو کی بھی تو لفظوں میں اچھالے پتھر

کاشمیری صاحب کی انشاؔ پر کی گئی اس تنقید سے پہلے میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اس غزل میں تغزل کی شان پامال نہیں ہوئی۔ کاشمیری نے انشاؔ کے صرف وہ اشعار دیے ہیں جن کا تعلق خارجی پہلو سے ہے۔ جب کہ انشاؔ کے ہاں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو زبان زدِ عام ہیں جیسے کہ: "نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی / تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں" حال آں کہ انھوں نے انشا کے تغزل پر تنقید کرتے ہوئے "آبِ حیات" کے حوالے دیے ہیں مگر انھیں "آبِ حیات" میں ایسے شعر نظر نہیں آئے۔ صفحہ 450 پر درج ہے کہ انشاؔ معنویت کی دنیا کا شاعر نہیں، اس کے بعد صفحہ 451 پر لکھتے ہیں کہ انشا نے غزل کے معنوی انتشار کی جگہ معنوی وحدت کو فروغ دیا۔ یہ بات سمجھ سے بالا تر ہے کہ ایک ایسا شاعر جو معنویت کی دنیا کا نہیں ہے، معنوی وحدت کو فروغ کیسے دے سکتا ہے۔؟ صفحہ 383 پر لکھا ہے کہ لکھنؤ کی ابتدائی تہذیب دلی کی طرح تھی۔ فرماتے ہیں:

> "لکھنؤ میں تہذیب و ثقافت کی جو نشو و نما اودھ میں ہوئی۔ اس میں گراں قدر حصہ اہلِ دلی کا تھا۔ یہاں کی تہذیب کا پودا دلی ہی سے گیا تھا۔ اس لحاظ سے لکھنؤ کے دبستان کو دلی ہی کی توسیعی شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دبستان کی تشکیل میں بنیادی کردار ان ہی شعرا کا تھا جو بہ ذاتِ خود ہجرت کر کے لکھنؤ پہنچے تھے یا پھر ان کی نئی نسلوں نے اس کو ترقی دی تھی۔"(28)

کسی مقام کی تہذیب و ثقافت میں وہاں کے معاشی، سیاسی اور مذہبی عقائد کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ کاشمیری صاحب کی فہرستِ کتابیات میں ابو اللیث صدیقی کی "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" بھی شامل ہے۔ اس تحقیقی کتاب کے آغاز ہی میں لیث صاحب نے ان سیاسی، معاشی اور مذہبی عناصر کی نشاندہی کی ہے جنھوں نے لکھنؤ کی تہذیبی فضا کو جنم دیا جو اپنی ابتدا یعنی نواب اودھ امین الدین کے عہد ہی سے دلی سے ممتاز تھی۔(29) لکھنؤ ہجرت کرنے والے شعرا جیسے کہ انشاؔ، جرأتؔ وغیرہ اس تہذیب سے متاثر ہوئے نہ کہ انھوں نے اس کے بنانے میں حصہ لیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دلی سے لکھنؤ ہجرت کرنے والے شعرا کی زبان نے ابتدا میں لکھنؤ کو متاثر کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں تشیُّع کے فروغ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> "حسینؑ کی ذات کی اعلیٰ ترین صفات کی نفی اس تہذیب کا ایک تضاد بن گیا تھا۔ نوحہ گری اور ماتم پرستی کی روایت نے اس تہذیب کے اندر خود اذیتی کو پیدا کیا اور اس تہذیب کے پیروکاروں میں ایک مجہول انفعالیت کو فروغ ملا۔"(30)

کاشمیری کا یہ تجزیہ بذاتِ خود مجہول اور غیر ذمے دارانہ نوعیت کا ہے کیوں کہ لکھنوی تہذیب میں خود اذیتی کا نہیں، عیش کوشی کا رجحان غالب تھا، جس کا سبب معاشی فارغ البالی بنی اور اسی وجہ سے دلی کے شعرا نے بھی لکھنؤ کی طرف ہجرت کی۔ حسینؑ کی نوحہ گری اور ماتم پرستی کی روایت اگر خود اذیتی اور مجہول انفعالیت کو جنم دیتی تو ایران جو اس روایت کا سب سے بڑا علم بردار ہے لکھنوی تہذیب کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ گیا ہوتا۔ افسوس یہ بات تاریخ کے ایک ایسے مقام پر کہی گئی ہے جہاں سالوں پہلے نوحہ گر اور ماتم پرست ایران انقلاب کے ذریعے ساری دنیا میں اپنی دھاک بٹھا چکا ہے اور حزب اللہ یہودیوں کو ناکوں چنے چبوا رہی ہے۔ ایک ادبی مورخ کو اس قسم کے غیر ذمے دارانہ بیانات سے گریز کرنا چاہیے جو ادبی اور تنقیدی فضا کو متعفن کرنے کا سبب بن سکتے ہوں۔ کاشمیری نہیں جانتے کہ لکھنؤ میں بگڑی ہوئی تہذیب کی اصلاح کا بیڑہ مذہب ہی نے اٹھایا۔ مرثیہ جو رونے رلانے کے لیے لکھا جاتا ہے، لکھنوی تہذیب کے لیے مصلح ثابت ہوا۔ لکھنؤ کو دبستان قرار دے کر اس پر سب سے پہلے تحقیق کرنے والے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> "مصنوعی رنگ اور پست جذبات نے جو لکھنوی شاعری میں راہ پا گئے تھے، لکھنؤ کی سوسائٹی اور مذاق کو پایہء ثقاہت سے گرا دیا، لیکن مرثیہ نگاری نے اس کا بدل کر دیا۔"(31)

کاشمیری کا مذہب و عقیدہ معلوم نہیں کیا ہے مگر ایک ادبی مورخ سے توقع کی جاتی ہے کہ ہر مذہب سے تعلق رکھنے والی مقدس شخصیات کے ذکر میں تعظیمی الفاظ و القابات کو ملحوظِ خاطر رکھے۔ کاشمیری نے جہاں بھی آئمہ اثنا عشری کا ذکر کیا ہے، وہاں کوئی تعظیمی سابقہ یا لاحقہ استعمال نہیں کیا۔ امام حسینؑ کے ساتھ بھی کہیں امام یا حضرت کا

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1, 2024

لفظ لکھنا گوارا نہیں کیا صرف "حسین" لکھا ہے۔ حتا کہ تعظیمی نشانات بھی جیسے کہ "رح" یا "رض" جو عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں، موجود نہیں ہیں۔ ممکن ہے یہ کتابت کا سہو ہو مگر یہ سہو ساری کتاب میں موجود ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مسلم بزرگانِ دین کے اسما کے ساتھ حضرت یا امام کے تعظیمی الفاظ ہی لگائے جائیں۔ اس کتاب کی اب تک کی بحث سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

I۔ تاریخی حقائق کی چھان بین پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

II۔ کئی کئی صفحات پر حوالے موجود نہیں ہیں

III۔ شعرا کے ذکر اور تصانیف کے تجزیوں میں اعتدال سے کام نہیں لیا گیا، صرف چند مشاہیر پر تمام توجہ صرف کی گئی ہے۔

IV۔ خاکے میں کوئی منصوبہ سازی نظر نہیں آتی۔ اسی وجہ سے نہ ابواب کا درست تعین کیا جا سکتا ہے نہ ذیلی عنوانات کا۔

V۔ حوالے دینے کا کوئی ایک طریقہ ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا، جہاں جی چاہا باب کے اندر یا باہر حواشی دے دیے ہیں۔

VI۔ تاریخ کی چھوٹی سے چھوٹی جزیات کو بھی جو کہ ضروری نہیں جا بہ جا بیان کیا ہے اور پھر تاریخ و سیاست کے الگ ابواب بھی بنائے ہیں۔

VII۔ بعض ضروری مواقع پر تخلیقات کے نمونے موجود ہونے چاہییں تھے جو کہ نہیں دیے گئے۔

VIII۔ یہ کتاب دکنی ادب تک تو تاریخِ ادب نظر آتی ہے مگر اس کے بعد صرف تجزیوں کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔

IX۔ اس تاریخ کو پڑھ کر آخر تک معلوم نہیں ہو تا کہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کون ہے اور اردو نثر کی پہلی کتاب کون سی ہے اور کس نے لکھی ہے۔؟

X۔ ہجری سنین کے باالمقابل صرف ایک عیسوی سنہ دیا ہے جب کہ احتیاط کا تقاضا ہے کہ ہجری سال کا مہینا اور تاریخ معلوم نہ ہونے کی صورت میں دو عیسوی سال دیے جائیں۔

تبسم کاشمیری نے سارا زور تجزیہ نگاری پر صرف کیا ہے لیکن کیا کوئی کتاب صرف تجزیہ نگاری کی بدولت تاریخِ ادب بن سکتی ہے۔ اس بارے میں اسپلر کے حوالے سے گیان چند کا یہ بیان بھی مدِ نظر رہے:

> "اسپلر نے سب سے اہم بات یہ کہی ہے کہ ادبی مورخ کو نظریے اور تنقیدی تجزیے کا کام دوسروں پر چھوڑنا ہو گا۔۔۔ ان اردو والوں کو اس نکتے پر خاص توجہ کرنی چاہیے جو ادبی تاریخ کو ادبی تنقید کے مترادف بنا دیتے ہیں۔"(32)

تاہم اس کتاب میں درج ذیل خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں:

I۔ اس تاریخ ادب کو کو دیدہ زیب سرورق کے ساتھ مضبوط جلد میں نفاست سے شائع کیا گیا ہے۔

II۔ کتاب کو تصاویر سے آراستہ کیا گیا ہے۔ نقشے بھی دیے ہیں تا کہ اس دور کی جغرافیائی حدود کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

III۔ ادبی کتب کے جائزوں میں اگرچہ کوئی نئی بات نہیں ہے مگر ادب کے عام طالب علم کے لیے فائدہ مند ہو سکتے ہیں۔

IV۔ کتاب کے اختتام پر دکن کی بہمنی سلطنت، مغلیہ، اودھ، بیجاپور، گول کنڈہ اور احمد نگر کی ریاستوں کے حکمرانوں کے نام دورِ حکومت کے سنین کے ساتھ یاداشت کے لیے درج کیے گئے ہیں۔

V۔ آخر میں مقامات، کتب، اسما و ادارہ جات کا اشاریہ مرتب کیا گیا ہے جس سے آج کل عام طور پر صرفِ نظر کیا جاتا ہے، مگر افادیت کے لحاظ سے اہم ہے۔

کاشمیری کی اس ادبی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کتاب میں خوبیوں کے مقابلے میں خامیاں زیادہ ہیں۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تبسم کاشمیری ادبی مورخین کی فہرست میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکے۔ پس ورق پر لکھی گئی تعارفی تحریر میں بتایا گیا ہے کہ کاشمیری اس کتاب کی دوسری جلد کی تکمیل میں مصروف ہیں، اب تک یہ جلد منظرِ عام پر نہیں آئی۔ امید یہی ہے کہ اگر یہ کتاب کبھی شائع ہوئی تو اس میں یہ خامیاں نہیں ہوں گی جو پہلی جلد میں موجود ہیں۔

حوالہ جات

1۔ کاشمیری، تبسم، "اردو ادب کی تاریخ، ابتدا سے 1857ء تک"، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2003ء)، ص:15

2۔ ایضاً، ص:12۔13

3۔ ایضاً، ص:14

4۔ ایضاً، ص:9۔10

5۔ ایضاً، ص:15

6۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اردو" (جلد اول)، (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ستمبر/2008)، ص:36

7۔ کاشمیری، ص:291

8۔ ایضاً

9۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اردو" (جلد دوم)، (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، اپریل/2009)، ص:654

10۔ کاشمیری، ص:35

11۔ جالبی، جلد اول، ص:626

12۔ ایضاً، ص:168

13۔ جین، گیان چند، ڈاکٹر، "اردو کی ادبی تاریخیں"، (کراچی: انجمنِ ترقی اردو، 2000ء)، ص:701

14۔ ایضاً، ص:706

15۔ صدیقی، ابو اللیث، ڈاکٹر، "تاریخ زبان و ادب"، (کراچی: رہبر پبلشرز، اردو بازار، 1998ء)، ص:173

16۔ گیان چند، "اردو کی ادبی تاریخیں"، ص:705

17۔ ایضاً، ص:706

18۔ ایضاً، ص:703

19۔ کاشمیری، ص:20

20۔ صدیقی، "تاریخِ زبان و ادبِ اردو"، ص:53

21۔ جالبی، جلد اول، ص:7

22۔ کاشمیری، ص:21

23۔ ایضاً، ص:22

24۔ زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر، "ہندوستانی لسانیات"، (لاہور: مکتبہ معین الادب، 1961ء)، ص:115۔116

25۔ عبد الودود، ڈاکٹر، "اردو سے ہندی تک"، (کراچی: مجلسِ فکر و ادب، 1984)، ص:33

26۔ کاشمیری، ص:43

27۔ ایضاً، ص:446

28۔ ایضاً، ص:383

29۔ صدیقی، "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، ص:34۔46

30۔ کاشمیری، ص:485

31۔ صدیقی، "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، ص:789

32۔ جین، گیان چند، ڈاکٹر، "تحقیق کا فن"، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2003ء)، ص:363